نیلم تاج
پی ایچ ڈی سکالر ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ
ڈاکٹر نذر عابد
شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ
ڈاکٹر محمد الطاف
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو ہزرہ یونیورسٹی مانسہرہ

ڈاکٹر سید امجد حسین کی تحریروں میں پشاوری ناسٹلجیا

Neelam Taj
Scholar Ph.D Urdu, Hazara University, Mansehra.
Dr. Nazar Abid
Department of Urdu, Hazara University, Mansehra.
Dr. Muhammad Altaf
Associate Professor, Department of Urdu, Hazara University, Mansehra.

Peshawari Nostalgia in the Writings of Dr. Syed Amjad Hussain

Nostalgia is a humming chime of bells and whistles that bind a chord in the chamber of the soul. Memories., whether happy or sad, accompany the journey of the life.the smell of the memories of the good time gone by brings some pleasure in the deep sleep and make you suffer some kind of pain, this has always been the rule of life. Who escapes from it! Something always happens in our life and yours. From birth to death! The intermission just keeps on passing and those bygone time and moments are what we call nostalgia. When such time passes and behind are only the memories of the bygone are left which are perfuming our heart and mind like a cool breeze from time to time.

Key Words: *Nostalgia, Memories, Peshawari, Dr. Syed Amjad Hussain*

یادیں زندگی کا سب سے اہم سرمایہ ہوتی ہیں جو ذہن کے جھروکوں سے جھانکتی رہتی ہیں۔ یہ یادیں ہی ہیں جو خواب کی گہرائیوں میں رقص کناں ہوتی ہیں۔ تنہائیوں کی ساتھی اور ہم دم یادیں ہی تو ہیں جو ماضی اور حال کو

آپس میں مدغم کر دیتی ہیں۔ ناسٹلجیا کو ماضی میں ایک نفسیاتی بیماری تصور کیا جاتا رہا ہے لیکن اسے نفسیاتی بیماری کے بجائے نفسیاتی اور صحت مندانہ رجحان کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اسے ہم گزرے ہوئے لمحوں کے شدید احساس سے تعبیر کرتے ہیں۔

لفظ ناسٹلجیا کو سب سے پہلے ایک فرانسیسی نفسیات دان جونسس ہوفر نے ۱۶۸۸ء کو اپنی کتاب "Medical Dissertation on Nostalgia" میں ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جو حالت مسافرت میں تھے اور سخت ناامیدی اور اداسی میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹر شید احمد اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ایک شخص پردیس میں حالت جنگ یا روٹی کی خاطر سکونت اختیار کرتا ہے۔ اس کے دل میں وطن کی یاد رہ رہ کر اٹھتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے وطن کو جائے۔ وطن واپس جانے کے لیے وہ بہت محنت کرتا ہے اور کسی قسم کا آرام اپنے لیے گوارا نہیں کرتا۔ حتیٰ کی شادی کی خواہش کو بھی رد کر دیتا ہے اور جس قدر ہو سکے پس انداز کرتا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی غرض جس کی وجہ سے وہ یہ تکلیفیں برداشت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے وطن کو جا سکے اور اپنے پیاروں سے مل سکے۔ جب ایسا نہ ہو تو وہ حال میں زندہ رہنے کے لیے ماضی کی حسین یادوں میں پناہ لے کر راحت محسوس کرتا ہے تو وہ ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتا ہے۔"[۱]

انسان اپنے حال کو بہتر بنانے کے لیے اپنے گزرے ہوئے ماضی کے خوبصورت لمحوں کو یاد کرتا ہے اور اپنے آنے والے کل کے سنہرے خواب دیکھتا ہے۔ وہ ماضی سے کٹ کر مستقبل میں کسی بھی صورت جی نہیں سکتا بلکہ ماضی کے خوبصورت اور خوشگوار لمحوں کو ذہن میں رکھ کر مستقبل کے اتار چڑھاؤ، مصیبتوں اور مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کر کے اپنے مستقبل کو بہتر بناتا ہے۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت ہے جو ماضی کو حال میں لے آنے کے علاوہ اس بات کا بھی اہتمام کرتی ہیں کہ انسان یادوں کے روشن چراغ سے اپنے مستقبل کی راہوں کو بھی تابندہ بنانے پر قادر ہو جائے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو حرکات ذہنی کو ظاہر کرتی ہے۔

فرہنگ اصطلاحات میں ناسٹلجیا کے معنی کچھ یوں ہیں۔

> "غم یادِ وطن، دردِ وطن، عارضِ وطن، ماضی پرستی، مریض یادِ وطن میں مخبوط۔"[۲]

لرنرز ڈکشنری کے مطابق اس کے معنی ہیں:

"اسم حالت: خوشی اور غم جو ماضی کی کسی چیز کو یاد کرنا، اور ایسی خواہش کا پیدا ہونا کہ آپ ماضی کو دوبارہ جینا چاہے اور ایسے دوبارہ تجربہ کر سکیں۔،،[۳]

اسی طرح مختلف ڈکشنریز میں ناسٹلجیا کو ایک شدید گھریلو بیماری کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔یعنی اپنے حال میں اپنے ماضی اور زندگی کے خوشگوار یادوں کو افسوس ناک انداز میں یاد کرنا اور ان کے واپس لوٹنے کی شدید خواہش کرنا۔ یا ماضی کی کسی مدت یا نا قابل واپسی حالت میں واپسی کے لیے حد سے زیادہ جذباتی تڑپ۔ ہمارا گزرا ہوا وقت ہم سے بچھڑے ہوئے لوگ، وہ مناظر جو تبدیل ہو چکے ہیں، وہ ثقافت جو ختم ہو کر ناپید ہو چکی ہے اور ہماری مٹتی ہوئی اقدار مطلب ہر گزرا ہوا لمحہ جو ماضی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ہم میں سے ہر انسان کو کم یا زیادہ یاد آتا ہے اور یہی یاد ہماری بے چینی کا باعث بنتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت صرف اپنوں سے دوری، اپنے وطن، اپنے گھر اور زمین سے دور ہونے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کی طرف لوٹنے کی خواہش بھی ضروری ہے۔

لفظ ناسٹلجیا جو حرکات ذہنی کو ظاہر کرتا ہے بظاہر تو لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ اصل میں دو یونانی الفاظ سے مل کر بنا ہے۔ جس کے معنی گھر یا وطن کی طرف درد آلود واپسی کے ہیں۔

آکسفورڈ انگلش ٹو اردو اینڈ اردو ٹو انگلش ڈکشنری میں ناسٹلجیا کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

؛ماضی کو اتھاہ یا شدت کے ساتھ یاد کرنا ناسٹلجیا ہے۔،،[۴]

ہر انسان کے اندر ایک ناسٹلجیک وجود ہوتا ہے۔ایک ایسا وجود جو کسی بھی بات سے خوش نہیں ہوتا۔ انسان کے ذہن میں جب جذبات کا لاوا پک جاتا ہے۔ جذبات کے انخلاء کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تو گزری ہوئی باتیں انسانی دماغ میں گھومتی پھرتی ہیں۔ یوں انسان ذہنی اور نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ یہ تمام ذہنی بیماریاں ایک ہی خیال کی گردش مسلسل سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر ناسٹلجیا ان میں نہیں۔ناسٹلجیا ایک احساس ہے ایک ایسی آرزو ایک ایسی خاموشی جس کو پورا کرنے کے لیے انسان کا غم غم کائنات بن جاتا ہے۔ یہ ایک انتہائی خوبصورت احساس تنہائی ہے جو ہر انسان میں نمو پاتا ہے اور یہ اس لیے ہوتی ہے کہ انسان کے پس منظر میں کہیں اس جنت کا یا جنت سے دوری کے علاوہ ایک محبوب ذات سے جدائی کا ہلکا ہلکا غم اس کے وجود میں ہمیشہ رہتا ہے۔ مگر وائے قسمت! کہ انسان اس غم کو برداشت نہیں کر پاتا اس کی تعبیر نہیں کر پاتا۔ اور دنیا میں اس کے مختلف حل ڈھونڈتا ہے۔ کبھی آپس میں انسانی محبتوں سے اور مال و اسباب کی کثرت میں اس ناسٹلجیا کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بہت دور کی مہدوم خواہش اور قربتیں پروردگار ہیں اور جب تک وہ نصیب نہ ہو احساس تنہائی جاتی ہی نہیں۔

ہر ادیب اپنے معاشرے کی روایات، رہن سہن، اقدار، تہذیب اور رسم رواج کو شعوری اور لاشعوری طور پر اپناتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات وواقعات اور سیاسی وسماجی مسائل پر فن کارانہ اظہار خیال کرتا ہے۔ڈاکٹر سید امجد حسین ایسے ہی ادیبوں میں شامل ہیں۔انھوں نے ایک طویل عرصہ بیرون ملک گزارا۔وطن، کلچر اور اپنوں سے دوری کے باعث ان کی شخصیت میں ناسٹلجیائی کیفیت پائی جاتی ہے۔خاص طور پر پشاور شہر کے حوالے سے ان کی جذباتی وابستگی اس ناسٹلجیا کا غالب رجحان ہے۔ان کی تمام تحریریں پشاور سے شروع ہو کر "ہائے پشاور وائے پشاور" پر ہی ختم ہوتی ہیں۔پشاور کلچر سے وابستگی کے توسط سے اپنے اہل پشاور کو یاد کرنا ڈاکٹر سید امجد حسین کی تحریروں کا نمایاں وصف ہے۔اپنے وطن اور شہر سے ہزاروں میل دوری کے باوجود ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے وطن اور خاص کر پشاور شہر کی فضاؤں میں محسوس کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> "وقت ایک بہتا دریا ہے اور دریا کبھی نہیں رکتا اور نہ روکا جاسکتا ہے اب جو میں اس دریا کے دھارے کے ساتھ غروب آفتاب کی طرف عازم سفر ہوں اور جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ان راہوں پر مجھے میرے قدموں کے دھندلے نشان نظر آتے ہیں ان راہوں پر مجھے آشنا چہرے نظر آتے ہیں ان راہوں میں میرے مہربان (اور چند نا مہربان) اساتذہ ہیں ان راہوں پر میری درسگاہیں ہیں اور تعلیمی ادارے ہیں جن میں سے میں گزرا ہوں جہاں پر میں نے زندگی اور جوانی کے بھرپور دن گزارے ہیں۔وہ سارے چہرے، وہ ساری درسگاہیں اور وہ سارے اساتذہ میرے لیے روشنی کے مینار ہیں جن کی روشنی سے میں نے اپنے مستقبل کی راہیں متعین کیں۔جن کی روشنی قدم قدم پر میرے ہم رکاب رہی۔میرا شعور پکارتا ہے کہ میری ساری زندگی انہی روشنی کے میناروں سے مستعار ہے۔"(۵)

ڈاکٹر سید امجد حسین ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ماضی سے دور نہیں ہوتے یا یوں کہیے کہ دور ہونا نہیں چاہتے۔ان کا اصل سرمایہ ہی ان کی ماضی کی خوشگوار یادیں ہیں۔ان کی تمام تصانیف میں پاکستان اور پاکستان کے دور افتادہ علاقوں کی تازہ ہوا کے جھونکے اور اپنی مٹی کی سوندھی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ بے نام معصوم رشتوں کی پرخلوص اپنائیت اور یگانگت کی جھلک دکھلائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر امجد حسین پیشے کی اعتبار سے سرجن ہیں جو انسانی میکنزم میں خون کی نالیوں کی مرمت یا جسم کی پھل پیریوں کی صفائی کر کے زندگی کے امکانات تابندہ کرتے ہیں۔ایسا ہر عمل اپنے پس منظر میں ایک اساسی نوعیت کے جواز پر ایستادہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر امجد کو یہ وصف کوزہ گری آغاز زندگی میں ہی عطا ہو گیا تھا۔جس کے سبب ان کے اپنے نفسیاتی میکنزم میں ایک ہمہ گیر دردمندی، تعظیم انسانیت، شعور حیات سے مملو جذبی کیفیات اور غیر مختتم محبت دائمی قدر بن گئی۔شاید ان کے اسی انداز ہائے فکر کا نتیجہ ہے کہ ان کا پورا عصر ان کے وژن میں اور پورا ماضی ان کے باطن میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔چیزوں کو کرید کرید کر زندگی تراشنے کی آرزومندی ان کے پیشے کی عطا بھی ہے اور ان کی انسان دوستی کی بنیاد بھی۔یہی طرز وارفتگی انہیں ماضی کی کرید کی طرف لے جاتی ہے اور وہ تیزی سے گھومتے ہوئے وقت کے چاک پر ماضی کی نرم مٹی سے اپنی یاد کی شکلیں بناتے چلے جاتے ہیں۔ان انسانوں کی جن سے وہ مکتب میں ملے، عمارتوں کی جہاں سے وہ گزرے، رویوں کی جن سے واسطہ پڑا اور محبتوں کی جو عمر بھر سمیٹتے رہے۔اپنے معروض کی صورت گری کے لیے کبھی یاداشتی مظہر کا دامن تھام کر ماضی میں اتر جاتے ہیں، کبھی ماورائے حیات ادراک ان کی مدد کرتا ہے۔وہ ان کرداروں کی تلاش میں کبھی بصارت کی حدود میں رہتے ہیں اور کبھی بصیرت کی ساحرانہ فطرت سراپے کو ڈھالتی، ان کے باطن میں اتر کر ان کی پالیدہ اور ناپسندیدہ عناصر کو بعینہ ہی کردار کی شناخت بنادیتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر امجد حسین کے قریبی دوست ڈاکٹر اعجاز راہی لکھتے ہیں:

"وہ کردار کو عصر حاضر میں نہیں لاتے، قاری کو ماضی میں لے جاتے ہیں تاکہ جیسا وہ تھا ویسا وہ نظر آئے۔آدمی کو اگر اس کے پس منظر سے الگ کر دیا جائے تو وہ پونا آدمی رہ جاتا ہے۔پورا تو وہ تب ہوتا ہے جب اسے اس کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے اور ڈاکٹر امجد فن کی اس باریک بینی سے کماحقہ واقف ہیں۔"(۶)

یادیں خوشگوار ہو یا دلخراش زندگی کے سفر میں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔اچھے وقتوں کے گزرے لمحات کی یادوں کی مہک گہری نیند میں کس مزے سے پہنچا دیا کرتی ہیں اور تکلیف دہ کیسی اذیت میں مبتلا کر دیتی ہیں ۔زندگی کا یہی دستور ہمیشہ سے رہا ہے اس سے کسی کو فرار نہیں! ہماری آپ کی زندگی میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے پیدائش سے لے کے موت تک بیچ کا وقفہ بس گزرتا رہتا ہے۔اور انہی گزرے ہوئے لمحوں کو ہم "یاد ماضی" یا " ناسٹلجیا" کہتے ہیں۔پروفیسر فصیح احمد صدیقی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"زمانہ اور زندگی بے اندازہ تیزی اور شدت سے منقلب ہو رہے ہیں جیسے:" نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" اور پیچھے صرف گزرے ہوئے زمانے کی یادیں ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً ہمیں ٹھنڈے ہوا کے جھونکے کی طرح دل و دماغ کو معطر کر رہی ہے۔ لیکن ہلکا ہلکا درد، احساس ایک چبھن جو دل و دماغ کو بے چین رکھتی ہیں۔ اور ہم ہر وقت اضطراب کے عالم میں ہوتے ہیں۔"(۷)

ناسٹلجیا کی ایک صورت خود اختیار کردہ مہاجرت کے نتیجے میں سامنے آتی ہے چونکہ ہمارے معاشرے میں مسائل میں پیچیدگی مسلسل چلی آرہی لہذا لوگوں کے یہاں اپنے ماحول سے غیریت، بیگانگی اور ناسٹلجیا پیش در پیش چلا آرہا ہے۔ نظام جبر، جمہوری قدروں کی پامالی اور غربت اور بے روزگاری کی وجہ سے عموماً لوگ یورپی ممالک کی طرف سفر کرتے ہیں۔ اپنے اپنے خاندان کے لیے زرمبادلہ کمانے کی فکر میں تمام زندگی وطن سے دور گزارتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہاں ناسٹلجیا جنم لیتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید امجد حسین اپنی کتاب "یک شہر آرزو" میں لکھتے ہیں:

"مجھے امریکہ میں رہتے کم و بیش ۶۰ سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اس لمبے عرصے میں پشاور کے گلی کوچوں کی یاد دل سے محو نہیں ہوئی۔ سینٹ چارلس ہسپتال کے آپریشن تھیٹر سے، جہاں میں اکثر اوقات آپریشن کرتا ہوں، مسلم مینا بازار کا فاصلہ میں ایک لمحے میں طے کر لیتا ہوں اور میں یہ سفر دن میں کئی بار کرتا ہوں۔ گھڑی دیکھتا ہوں تو ذہن خود بخود پشاور چلا جاتا ہے۔ میرا ذہن مجھے بتا دیتا ہے کہ امریکہ میں تو شام کے سات بجے ہیں لیکن پشاور میں صبح کے پانچ بجے ہوں گے۔ مجھے محلے کی مسجدوں سے فجر کی اذانیں سنائی دیتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خیال آتا ہے کہ اب سکول کے بچے یونیفارم پہنے، گلے میں بستے لٹکائے، سکول جا رہے ہوں گے۔ گوالے بھینسوں کے ریوڑ شہر کے گلی کوچوں میں سے گزارتے شہر سے باہر چراگاہوں کو لے جا رہے ہوں گے۔ سبزی منڈی میں ٹریفک جام ہو چکی ہو گی۔ بازار قصابان میں گاہکوں اور مکھیوں کی بھیڑ جمع ہو چکی ہو گی۔ اس طرح مختلف اوقات میں شہر کی سرگرمیوں کی تصویر آنکھوں کے آگے کھنچ جاتی ہے۔ سہ پہر کی چائے، شاہی باغ میں فٹ بال کے میچ، گلیوں میں گرم

ریت کے بھٹے بیچنے والوں کی آوازیں، "ریت دے سٹے" بھانت بھانت کی آوازیں، پالش، مالش، سوکھی روٹیاں، ردّی، خالی ڈبے وغیرہ وغیرہ۔ پھر رات پڑتے ہی گلیوں کا نیند میں ڈوب جانا، شہر خموشاں کا سا سماں، رات کے سناٹے میں گھنٹہ گھر کے گھنٹہ بجنے کی آواز، اور پھر علی الصبح دوبارہ ایک نئے دن کا آغاز۔"(۸)

ڈاکٹر سید امجد حسین ان لوگوں میں نہیں جو ہجرت کرتے وقت اپنا سبھی اثاثہ لاد کر چلے گئے یہ جتنا کچھ ہجرت کرتے وقت اپنے ساتھ لائے ہیں اس سے کہیں زیادہ اور کہیں پیش قیمت اثاثہ اپنے وطن اپنے شہر پشاور میں چھوڑ کر آئے ہیں ۔ وہ اس اثاثے کو چھوڑ کر امریکہ جانے پر مجبور تھے۔ لیکن ان کی دیکھ بھال کرنے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ روحانی رشتوں کو ہجرت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ان بدقسمت مہاجرین کے زمرے میں آتے ہیں جو ہجرت کرتے وقت دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک حصہ جسم کے ساتھ رہتا ہے اور دوسرا روح کے ساتھ کہیں دور، بہت دور اور ڈاکٹر سید امجد حسین اسی دور بہت دور والے علاقے میں اپنی معصوم یادوں کی سنگت میں اکثر گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ اور اپنے دل کو تسلی دیتے رہتے ہیں۔ امریکہ یا ایسے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں ہجرت کر کے آجانے اور پرسکون زندگی جی کر مطمئن ہو جانے والے شاید ڈاکٹر امجد حسین کی تخلیقات کی وہ پذیرائی نہ کر سکیں جن کے وہ مستحق ہیں۔ اس ہجر کے کرب کو محسوس کر پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناسٹلجیا ایک ایسی گنگناتی ہوئی انگڑائیوں اور کروٹوں کی جھنکار ہے جو روح کے ایوان میں ایک سماں باندھ دیتی ہے۔ کوئی بھی بڑا فن اس وقت تک بڑا فن پارہ نہیں بن سکتا جب تک اس میں احساس کو جھنجھوڑنے کی صلاحیت نہ ہو۔ ڈاکٹر سید امجد حسین کے یاداشت میں جو کچھ بھی تھا انھوں نے وہ سارے کا سارا صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ناسٹلجیا ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جو خیال کو ہمہ وقت کئی زمانوں تک رسائی دے سکتی ہے۔ ڈاکٹر سید امجد حسین کالم، خاکے، مکاتیب، مضامین اور افسانے پڑھنے کے بعد مجموعی تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ جملہ تمام اصناف میں ناسٹلجیا بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ ناسٹلجیا محض یادِ ماضی کے ذکر تک محدود نہیں بلکہ اس میں کئی حوالوں سے انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پشاور شہر کی تہذیب اور ماضی کی بازیافت ان سے بہتر کسی قلمکار کی تحریروں میں موجود نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر شید احمد خان، ہماری نفسیات، انجمن ترقی اردو، (ہند دہلی) ۱۹۳۹، ص ۶۱۲

۲۔ فرہنگ اصطلاحات، مرتبین، اشفاق احمد، محمد اکرام چغتائی، جلد دوم، (ای تا او) اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۲۱۔

۳۔ W.W.W Learners dictionary.com

۴۔ آن لائن اکسفورڈ انگلش ٹو اردو اینڈ اردو ٹو انگلش، ڈکشنری۔

۵۔ ڈاکٹر سید امجد حسین، در مکتب، لٹریری سرکل آف ٹولیڈو، امریکہ، ۲۰۰۵، ص، ۲۲۱۔

۶۔ ڈاکٹر سید امجد حسین، اعجاز راہی، مشمولہ، در مکتب، لٹریری سرکل آف ٹولیڈو، امریکہ، ۲۰۰۵، ص ۶۔

۷۔ پروفیسر فصیح احمد صدیقی، یادوں کی مہک، یونیورسل بک ہاوس، علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۰۰ء، ص، ۴۳

۸۔ ڈاکٹر سید امجد حسین، یک شہر آرزو، بشیر آرٹ پریس، پشاور، پاکستان، نومبر ۱۹۹۵، ص، ۹۔